⊙ ڈاکٹر عمران ازفر
لیکچرر، شعبہ اردو و مشرقی زبانیں، سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا

# انگریز استعمار کی سماجی مبادیات اور نظیر کا نظمیہ متن (ثقافتی و معاشی تناظر)

**Abstract**:

Nazeer Akbarabadi, prominent poet from 18th century creates traditional India via his poetic verses and socio-political frame of thinking. Nazeer presented common man life through poetic diction and paint the concrete and steel images of indo-pak middle class life style, Cultural and Economical prospect according to his time period. Nazeer Akbar Abadi's poem is deep and strong creative recreation and reflection of middle class life which was facing countless socio-political and cultural ethical values in British Raj. Although Nazeer belongs to era in which so called Mughal density was preparing last nights in Laal Qila but the real ruler's were destroying lay man life by their best to conquer the whole land of India behind the screen. When the cream poets of Urdu literature and poetry were buttering the Mughal's by Qaseeda n Ghazal, Nazeer was painting Common man pictures and their cultural changes in his poetic world. He was not connected with Raj Darbar and also nor was a straight critic of British Raj as Akbar Alha Abadi was. We can say that Nazeer's poetic works are the real recreation of indo-pak middle class civilization and their cultural values with their positive and negative plus and minus broad and narrow points of discussions. In this article the collective discourse regarding Indian cultural values is presented by the textual analysis of poetic version of that particular era. When common man was struggling in new aspects of life but upper class elite was enjoying their liberty with Raja Maharaja and British Business tycoons. Nazeer'spoems talks about the real problems of lay manlike Mufalsi, Paisa, Aata daal,Rooti, rupiya, Chapatti and Holi,

Devaliextra. In this article we have to interpret the poetic text by qualitative research methods of to analyse the socio political cultural environment of 18th century and the situation of common man in Nazeer poetry.In that particular era lay man was struggling for life humanity food health and other basic necessities of life.

**Keywords**:

Colonialism, Middle class , Socio-political, 18th century, Poetic Texts, Economic Aspect, Society, British Raj, Culture

اردو ادب کی تنقیدی فکریات کو روایتی تناظر میں دیکھا جائے تو ادب کے طالب علم دیکھ سکتے ہیں کہ اردو کے قدآور ناقدین نے شعری متون کے تجزیاتی مطالعات کے لیے خارجی ماحول، سیاسی درباری اشرافیہ اور ان عوامل کے معاشرے پر اثرات کے تناظر میں دیکھا جاتا۔ اس طرز تجزیہ میں متن کے تجزیات کے برعکس معاشرے میں برپا خارجی ماحول اور اس پس منظر میں جاری سیاسی سماجی کشاکش، جنگ و جدل، توڑ پھوڑ اور اجتماعی کینوس کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ اس صورت میں تخلیق کار اور اس کے تخلیقی متون کی موضوعی، جذباتی اور حسی کائنات کی حد بندی نہیں کی جاتی بلکہ خارج سے اس متن کے معنی کے تعین کی راہیں تلاش کی جاتی ہیں۔ یہ سلسلہ اردو میں عربی اور فارسی سے مستعار ہے اور آج بھی تخلیقی متون کے برعکس تنقیدی نظریات کی روشنی میں اردو کو مابعد جدید، مابعد نوآبادیاتی اور مابعد ترقی پسند عہد کے عنوان سے پہچانا جاتا ہے۔ گو اس کے واضح نشانات تخلیق کار کے متخیلہ میں موجود نہ بھی ہوں تو نقاد علامتی استعاراتی تفاعل کے سبب سے اس نوعیت کے مجازی معنوں کے استخراج میں کامیاب ہو جاتا ہے اور یہی روش نقاد کو "قابل اور لائق" ثابت کرتی ہے۔ ایسا ہی طرز عمل اردو تنقید کے باب میں شعری متون کے تجزیاتی ڈسکورس کے باب میں بھی دیکھا جاتا ہے۔ میر تقی میر کو اس بنیاد پر قنوطی، مایوس اور موت کے آسیب میں گھرا تخلیق کار تسلیم کیا جاتا ہے کہ اس کا زمانہ دہلی میں ایسی ہی قنوطیت، بے بسی، اداسی اور موت کی نفسیات کے علاوہ اسی نوعیت کے داخلی انتشار سے بھرا ہوا تھا باوجود اس کے کہ میر تقی میر کے ہاں غالب اظہار جنسی خواہش، ہم جنس پرستی، عورت کے بدن کی مختلف جہات، اپنی ذات پر زعم اور مقامی ثقافتی مکانیت کے کئی زاویے دیکھے جا سکتے ہیں حتی کہ ہم جنس پرستی ایسا موضوع بھی ان کے متن کا خاصا ہے جس کا خمیر ایہام گوئی کی تحریک میں بڑی وافر مقدار میں موجود تھا۔ چونکہ ہمارا مقالہ اپنی بنیاد میں اس موضوع کی تفاصیل کا متحمل نہیں ہو سکتا لہذا مزید طول سے گریز اختیار کرتے ہوئے براہ راست اپنے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ سوال کی ترتیب یوں ہے کہ ہم نظیر اکبرآبادی کے نظمیہ متون کے متن بنیاد داخلی تجزیے سے اُس عہد کے ہندوستان کو جانچیں گے جس عہد میں نظیر اکبرآبادی اپنی زندگی بسر کر رہے تھے۔ مقالہ میں اُن کے تخلیقی متون کے تجزیاتی مطالعہ کی مدد سے اُس عہد کی نفسیات، اُس زمانے میں سانس لیتے ہندوستان اور ہندوستانی انسان کی ترجیحات، خواہشات، متفرق کیفیات کو تجزیاتی تناظر میں بیان کیا جائے گا۔ سوال کی تخریج میں پہلے مرحلے پر اختصار کو برتتے ہوئے نوآبادیات/ استعمار کے معنی و مفاہیم کی حدود کو طے کیا جائے گا جبکہ دوسرا

قدمچہ نظیر اکبر آبادی کے نظمیہ متون کے استعاراتی، تشبیہاتی، رمزیہ، علامتی زاویہ ہائے تخلیق کی تسوید و تخریج کے عمل سے گزر کر ان میں زیر سطح آباد دنیا کو قاری کے سامنے لانے کی کوشش کی جائے گی۔ مفروضہ یہ ہے کہ دیگر تمام خصائص پر جس طرح نظیر کی نظم کو جانچا گیا ہے اسی طرز پر اس نظم میں جاری ثقافتی ارتقاء کا تجزیہ نہیں کیا گیا۔ نظیر کی نظم میں صدی بھر میں جاری ارتقاء پذیر ثقافتی ڈسکورس مسلسل بدلاؤ کا شکار ہے جس کے تمثال جا بہ جا موجود ہیں۔ اس باب میں نظیر کی نظم کے متون کے حوالے سے بات کی جائے گی۔ نوآبادیاتی استعمار پر انگریزی اور اردو ہر دو زبانوں میں مواد موجود ہے مگر بنیادی ماخذ انسائیکلوپیڈیا اور اصطلاحات کی کتب ہیں۔ اردو میں ضمیر علی بدایونی، ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر ناصر عباس نیر، ڈاکٹر قاضی افضال حسین، ڈاکٹر سید عامر سہیل، ڈاکٹر فرخ ندیم، ڈاکٹر الیاس بابر اعوان، ڈاکٹر کامران عباس کاظمی، ڈاکٹر خاور نوازش علی کی کتب اور مضامین اس باب میں طلباء کی رہنمائی کے لیے قابل بھروسہ مواد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال احمد آفاقی نے بھی اس موضوع پر مختصراً لکھا ہے مگر اس کا ادبی معیار مندرجہ بالا ناقدین سے کم تر درجے کا ہے۔

استعمار یا نوآبادیات کے معنی اور مفاہیم پر بات کی جائے تو پہلے تو اس بات کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ عموماً متبادلات کے طور پر استعمال ہونے والی ان تراکیب کے معنی میں اچھا خاصا بعد ہے۔ نوآبادیات وہ حاکم قائم کرتا ہے جو اپنی نوآبادیات پر حکومت کرنے کے ساتھ وہاں پر رہائش اختیار کرتا ہے یہ اس زمین کی ترقی میں اپنا کردار ادا کرتا ہے اسے عرف عام میں کالونی بھی کہا جاتا ہے استعمار سے مراد ایسا خطہ زمین ہے جس پر بدیسی لوگ حکمران ہوں اور اس کے وسائل کو اپنے لوگوں اور ریاست کے استعمال میں لانے کے علاوہ اس مقامی آبادی کو بے توقیر گردانتے ہوں امریکی دائرہ معارف استعماریت کو سامراجیت، شہنشاہیت سے جوڑتا ہے۔ اس کے مطابق نوآبادیات سامراجی طاقتوں کا مختلف محکومی علاقوں کے وسائل پر ہاتھ صاف کرنے کے لیے بنایا جانے والا نظام تھا اور اس کے ساتھ ان محکومین کو اپنی اطاعت میں رکھنا بھی اس نظام کا بنیادی جزو تھا(۱)۔ نوآبادیاتی نظام کو سادہ ترین اور عام فہم لفظوں میں بیان کیا جائے تو اس سے مراد کسی ایک زمین کے لوگوں کا دوسری زمینوں پر جا کر اپنے لیے مفید یا موثر نئی آبادیاں قائم کرنا اور اردگرد کے علاقوں پر قبضہ کر کے اسے توسیع دینا ہے۔ اس کے برعکس ایسی زمین جہاں نوآبادیات قائم کی جائیں اور نوآبادکار مقامیا فراد کے وسائل پر ہی قابض نہ ہو بلکہ مقامی اقوام کو مختلف طریقوں سے اپنا غلام بنا کر رکھے۔ یہ نظام عموماً کئی نئی طرح کے روایتی نظاموں کو مشکوک یا غیر معیاری قرار دے کر ان میں تبدیلی لے آتے ہیں اس صورت حال میں نئی قوم کے لوگ پرانے لوگوں پر اپنی اجارہ داری کے قیام کے لیے اپنی مرضی کے نئے قوانین بناتے ہیں یہ معاشرت اور حکومت کے نئے انداز متعارف کراتے ہی نہیں بلکہ انہیں طاقت کے بل پر نوآبادیات پر مسلط بھی کرتے ہیں۔ ہندوستان میں نوآبادیات کے حوالے سے مغل حکمران جبکہ استعمار کے تناظر میں انگریز راج نمایاں مثالیں ہیں۔ گو دنیا میں نوآبادیاتی نظام کی ابتدا پتھر کے زمانے سے ہوتی ہے مگر گزشتہ تین صدیاں اس باب پر ڈسکورس کے حوالے سے اہم ترین ہیں۔ اس زمانے میں نوآبادیات، استعمار، غلامی اور حکومت کے جدید نظاموں کو پوری تفصیل سے سمجھنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے۔

ہندوستان میں انگریز سرکار نے کئی طرح کی چالاک اور پیچیدہ حکمت عملیوں سے نہ صرف اس سرزمین پر اپنی حکومت قائم کی بلکہ لاتعداد سیاسی، سماجی، ثقافتی، تہذیبی تمدنی، انتظامی حربوں سے یہاں کے حکمرانوں، نظام حیات کے عملی

تفاعل غرض زندگی کے ہر شعبہ کو کم تر، غیر منظّم اور بے قاعدہ ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ انہوں نے مغل حکمرانوں کے نظام کو نہ صرف دقیانوسی قرار دیا بلکہ وہ اسے اس قدر غیر منظّم، کمزور حتی کہ اس قابل ہی نہیں سمجھتے تھے کہ جس قابلیت کے ہونے سے حکومت کرنے کی سکت پیدا ہوتی ہے۔ اس موضوع پر نیکولس ہیریسن کی رائے ملاحظہ کریں کہ جس میں اس کا خیال ہے کہ استعماری کلام (Colonial Discourse) کی خاص بات مغرب مرکزیت ہے۔ اس کے بنیادی تصور کے مطابق مغربی تہذیب کو انسانی ترقی میں اوج کی انتہائی صورت سمجھا جاتا ہے۔ اسی خیال سے درحقیقت وہ سراہا تھ لگتا ہے جو غیر مغربی اقوام کو وحشی، غیر مہذب اور بدتہذیب قرار دینے میں مددگار رہوتا ہے۔ یہ صورت حال اپنی اساس میں نسل پرستی اور تہذیب پرستش کی نمایاں مثال ہے۔ جس میں مغرب کے علاوہ تمام نوع انسانی کو عہد رفتہ کے عجائب خانے میں سلیقے سے سجانے کی کوئی شئے گردانا جاتا ہے جس کا زمانہ ایک عرصہ ہوا بیت چکا ہو(۲)۔ انگریزوں نے اپنی حکومت کے قیام کے ساتھ ہی ہندوستان میں اپنی ضرورت کے طبقے کی تشکیل کے ساتھ اپنے ہمنوا سیاست دانوں، مصنفین اور دیگر شعبہ ہائے زندگی کے لوگوں کو نوازنے کے عمل کا آغاز کیا۔ اس سارے ڈسکورس میں اکبرالہ آبادی وہ اکیلی آواز ہے جو انگریزی نظام پر طنز کے نشتر چلانے کے علاوہ اس کے خلاف کھل کر شعری متون کی صورت لکھتا ہے جبکہ دوسری طرف نظیر اکبرآبادی وہ اکلوتی آواز ہے جو راج دربار اور انگریزی راج سے الگ تھلگ رہ کر عام آدمی اور اس کی روزمرہ زندگی کو پوری تخلیقی ہنرمندی کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ نظیر کسی فرد، ادارے، نظام کو ہیرو بنا کر پیش نہیں کرتا اور نہ ہی کسی کو ولن کا روپ دیتا ہے۔ نظیر اکبرآبادی اٹھارہویں صدی کے وسط سے انیسویں صدی کے ابتدائی دو دہوں تک نہ تو مغل دربار کی قصیدہ خوانی کرتا ہے اور نہ ہی انگریز سرکار کی لکھنؤ تک رسائی پر آہ وزاری کرتے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ لیکن نظیر کی نظم ہندوستان کے عام آدمی کا حقیقی المیہ اور رزمیہ ہے جس میں انہوں نے ہندوستانی معاشرے کے متوسط اور نچلے طبقے کے انسان کی چلتی پھرتی تصویریں شاعری کے قالب میں ڈھال کر اس طرح پیش کر دی ہیں کہ یہ ایک طرف شعری متن ہے تو دوسری طرف ہندوستان میں سانس لیتے، زندگی کرتے، اطراف میں اپنے فعل وعمل میں الجھے فرد کی چلتی پھرتی زندگی کی ٹھوس اور واضح تصویریں ہیں۔ اردو شاعری کی روایت ایک طرف دربار سے منسلک شعرا کے قصائد اور غزلیہ شعری متون پر مشتمل تھی تو دوسری طرف نمائندہ مذہبی ہستیاں اور ان کے روز وشب اس کا ہدف تھے تو یہ ایک طرح سے اشرافیہ کی نمائندہ شاعری تھی جس میں عام، نچلے طبقے کے حتی کہ متوسط طبقے کے لوگوں کے لیے بھی کوئی خاص جگہ نہیں تھی۔ نظیر اکبرآبادی نے اٹھارہویں صدی میں عام آدمی اور اس کی نفسیات کو اپنی شاعری میں پرو کر اس جدتِ فکر کی بنیاد رکھی اور یوں شعری متون میں عام آدمی کی زندگی کے متفرق مظاہر کے بیان کرنے کے باب میں اولین نظم نگار ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ نظیر کی نظم اپنے معاشرتی تفاعل کو نہایت باریکی کے ساتھ دیکھتی ہے اور اسی گہرائی کے ساتھ روزمرہ کی عمومی نفسیات کو خاصتخلیقی تجربے کا حصہ بناتا ہے۔ نظیر اکبرآبادی کا زمانہ علم عروض، ردیف قافیہ، مطلع مقطع کی پابندی کا عرصہ ہے جس میں شاعر طے شدہ ہیتی اصولوں کے پابند ہوتے اور انہی مرتب کردہ قوانین کے مطابق اپنی شعری اقلیم کی نہاد رکھتے گو نظیر نے اسی ماحول میں پرورش پائی اور کسی حد تک ان اصولوں کا خود پر اطلاق بھی کیا کہ ان کی نظم میں قدیم نظم کے عروضی دائرے کی تکمیل کا سلسلہ پوری کامیابی سے آگے بڑھتا ہوا ملتا ہے۔ انہوں نے پابند نظمیں لکھیں، ردیف قافیہ کے پیمانے مدنظر رکھ کر نظم نگاری کی لیکن ان کی نظموں

کے موضوع انہیں نئی نظم کا حقیقی موجد اور آج کی نظم کا جدامجد بنا دیتی ہیں۔ان نظموں میں زندگی کے ہر رنگ کو کمال خوبی کے ساتھ دکھایا گیا ہے جن میں سے کچھ نمائندہ رنگوں کو ہم تجزیاتی مطالعہ کے ساتھ دیکھیں گے۔معروف انگریز نقاد فیلن نظیر اکبر آبادی کے حوالے سے یوں رائے دیتے ہیں:-

> ''حقیقی شاعری کے یورپی معیار ادب سے نظیر واحد ہندوستانی شاعر ہے۔ستم ظریفی دیکھیے کہ یہاں کے اہل و ادب اسے سرے سے شاعر ہی تسلیم نہیں کرتے۔نظیر واحد شاعر ہے جس کی شاعری عوام تک پہنچی ہے۔اس کی نظمیں گلی کوچوں میں پڑھیں اور گائی جاتی ہیں۔''(۳)

عوام تک سیاسی، سماجی، معاشی، ثقافتی، معاشرتی حوالوں سے رسائی حاصل کرنے والے اس شاعر کو عمر بھر نظر انداز ہونے کی ہزیمت کو برداشت کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ اسے شاعر تسلیم کرنے کو ہی تیار نہ تھے(۴)۔نظیر نے نہ صرف اپنی شعری صلاحیتوں کا لوہا منوایا بلکہ یہ اہمیت بھی حاصل کی کہ ان کا شعری متن راج دربار کی قصیدہ خوانی، عشق و عاشقی اور جنس و لطافت کے موضوعات کے علاوہ جنسیاتی تجربوں کی پیچیدگی سے لبریز ہونے کی بجائے زندگی اور اس کی جملہ خصوصیات کا مجموعہ ہیں۔ایسا ثقافتی، معاشرتی مجموعہ جو اپنے عہد اور اپنے معاشرے کی حقیقی تمثال کاری کرتا ہے۔ یہ وہ کائنات ہے جس میں محبوب کے گداز کندھوں پر عام آدمی کے میلے کو فوقیت حاصل ہے۔ یہ وہ نظمیہ جہاں ہے جس میں جنسی تجربے کی بجائے ہولی اور دیوالی کے رنگوں سے شعری تجربے کو بامعنی بنایا جاتا ہے۔ان نظموں میں بادشاہ کی قصیدہ خوانی کے برعکس عام آدمی کی معاشی صورت حال کا معروضی خاکہ بیان کیا جاتا ہے۔ایسا خاکہ جس میں روٹی کے لیے سسکتے انسان کی آہوں کی آواز پوری تخلیقی توانائی کے ساتھ سنائی دیتی ہے۔نظیر کی نظموں کے عنوانات جیسے بنجارہ نامہ، روٹی نامہ، کوڑی نامہ، جوگی نامہ ایک طرف اردو مثنوی کی زرخیز روایت کی نشاندہی کرتے ہیں تو دوسری طرف ان متون میں ہندوستان کے عام آدمی اور اس کی زندگی میں جاری معاشی ابتری کے زندہ و متحرک تمثال دکھائی دیتے ہیں۔نظیر کی نظم میں ہندوستان کے عوام اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں بارے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ''نظیر اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی زندگی کو جس طرح دیکھتے ہیں اپنی شاعری میں اسے بیان کر دیتے ہیں۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو انہیں تمام اردو شعرا سے منفرد و ممتاز کر دیتی ہے۔نظیر کی شاعری میں پہلی بار جیتی جاگتی زندگی اپنی توانائیوں اور کمزوریوں، حکمت و دانش اور حماقتوں، میلے ٹھیلوں اور توہمات و عقائد، رنگ رلیوں اور تہواروں کے ساتھ شامل ہوتی ہے۔''(۵)

نظیر اکبر آبادی کی نظم کسی سیاسی تہذیبی فلسفے کی پرچارک نہیں۔نہ ہی وہ غلط اور درست، نیک اور بد، خیر خواہ اور بدخواہ، وفادار اور غدار کے موضوعی اور فکری مغالطوں میں غلطاں دکھائی دیتا ہے۔ بلکہ نظیر اپنے سماج کی ثقافتی تہوں کو کمال خوبی کے ساتھ نظم کے پیرائے میں تمثال در تمثال بیان کرتا چلا جاتا ہے۔نظم ''روٹیاں'' جس کا اولین عنوان ''روٹیون کی تعریف مین'' تھا، نظم میں شاعر کے اسلوب کے ساتھ اس کے ثقافتی تصورات کی لزومیت کو آسانی سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔نظم میں روٹی اور پیٹ کے باہمی تعلق کی بنیاد پر ہندوستان میں جاری اس کشاکش کو تخلیق کیا گیا ہے جس سے نچلے طبقے کا ہندوستانی نبرد آزما تھا اور آج بھی ہے:

''جب آدمی کے پیٹ میں آتی ہیں روٹیاں
پھولی نہیں بدن میں سماتی ہیں روٹیاں
آنکھیں پری رخوں سے لڑاتی ہیں روٹیاں
سینے اپر بھی ہاتھ چلاتی ہیں روٹیاں
جتنے مزے ہیں سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں
روٹی سے جس کا ناک تلک پیٹ ہے بھرا
کرتا پرے ہے کیا وہ اچھل کود جا بہ جا
دیوار پھاند کر کوئی کوٹھا اچھل گیا
ٹھٹھا ہنسی شراب صنم ساقی اس سوا
سو سو طرح کی دھوم مچاتی ہیں روٹیاں'' (کلیات نظیر اکبر آبادی)

یاد رہے کہ نظیر کے ہاں 'ں' کی بجائے 'ن' کا استعمال ہے۔ ہمارے مطالعہ میں نظیر اکبر آبادی کا شعری کلیات منشی نول کشور پریس لکھنو کی طرف سے ۱۹۲۲ء میں شائع کردہ ہے۔ جس کی طباعت و اشاعت کا اہتمام سیٹھ کیسری داس نے کیا۔ اس کلیات میں جدید کلیات کے برعکس اردو کے دو صدی قبل رائج الفاظ کی اشکال اور متروکہ حالتوں سے بھی آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ چونکہ یہ موضوع تحقیق و تجزیہ کا متقاضی ہے لہٰذا اس حوالے کو باہتمام مضمون کا حصہ بنایا گیا تا کہ اردو کے سنجیدہ محققین اور ناقدین اس باب میں توجہ کریں۔ روٹی نامہ/ روٹیوں کی تعریف مین اپنے مجموعی ڈسکورس میں ہندوستان کے نظام معیشت میں غذا اور اس سے پیوست سیاسی سماجی ڈسکورس کا تخلیقی دست خط ہے۔ نظیر نے عوامی زبان میں ہندوستان کے عام آدمی کی زندگی اور اس سے جڑے معاشی، ثقافتی تفاعل کو کمال خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ نظیر نے ہندوی مقامی زبانوں اور اردو کے تال میل سے ایسا تانا بنا ہے جو نہ صرف اردو کے اپنے ساختے کو وسعت اور ہمہ گیری عطا کرتا ہے بلکہ اس نظام میں اردو میں موجود حلاوت، آہنگ اور داخلی شیرینی زیادہ خوبی کے ساتھ منظر عام پر آئی ہے۔

نظیر کی نظم کا ایک موضوع معاشی مسائل کی شاعرانہ پیشکش اور معاشی بدحالی کا بیان ہے۔ نظیر اپنے نظمیہ متون کے توسط سے اٹھارہویں صدی کے ربع آخر میں برپا معاشی بدحالی اور اس معاشی تنزلی کے سبب سے وقع پذیر ہونے والے ثقافتی بحران، غریب آدمی کی روزمرہ زندگی میں بے کسی اور جدید سرمایہ دارانہ نظام کے مقابل لاچاری، بے روزگاری کا شعری تجربے کی صورت نظمیہ پیرہن میں اظہار ہے۔ مفلسی، پیسا، آٹا دال، روٹی، روپیہ، چپاتی، تلاشِ زر نظیر کے ہاں نظموں کے عنوانات سے آگے بڑھ کر ثقافتی علامات کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ایسی علامات جو اپنے داخل میں موجود لسانی وسعت سے معنی و مفہوم کی کئی دنیائیں آباد کرتے ہیں۔ نظیر کے ہاں یہ موضوعات جن میں روٹی ایک طرف انسان کے پیٹ کو بھرنے کا وسیلہ ہے تو دوسری طرف ایک ایسی علامت ہے جو سماجی ثقافتی نظام میں انسان کی تونگری، اشرافیائی طرزِ حیات اور فارغ البالی کا استعارہ ہے تو دوسری جانب مشکل گزر اوقات کرنے والے عام متوسط نچلے طبقے کے فرد کی روزمرہ زندگی کی پیش کار ہے جس میں روٹی اپنی سطح پر مشکل سے ہاتھ آنے والی شئے، توکل اور صبر کی علامت کے طور پر سمجھی جا سکتی ہے۔

ہندوستان کے معاشی اور ثقافتی عوامل کو نظیر نے جا بجا بیان کیا ہے۔ گو ہمارا مضمون اس موضوع کی وسعت کے محل سے پھیلاؤ کا حامل نہیں ہوسکتا اس لیے اس بیان میں چند اور مثالوں کے بعد بحث کو سمیٹا جائے گا۔ نظیر کی نظم میں معاش اور داخلی سماجی ثقافت باہم پیوست ہو کر آگے بڑھتے ہیں۔ ان متون کو نہ خالص اقتصادی اور معاشی موضوعات کی ذیل میں دیکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی ثقافتی پیش کار کے نمونے کے طور پر تجزیاتی کسوٹی پر پرکھا جا سکتا ہے (باوجود اس کے کہ اردو ناقدین کے ان موضوعات سے نظیر کے کلام کی تشریحات کی ہیں)۔ نظیر کے ہاں معاشی صورت حالی اور ثقافتی تفاعل دو اہم اور بنیادی لوازمات کی صورت ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے ہیں اور یہی نظیر کا امتیاز ہے جس کی طرف اردو ناقدین نے خاص توجہ نہیں کی۔ ابوالخیر کشفی نظیر کی نظم معاشی صورت احوال کو اردو تنقید کے روایتی پیرائے میں دیکھتے ہیں:

> ''آٹا، دال اور پیسے کو نظیر اکبر آبادی نے انسانی ہستی کی تلخ اور حقیقی انداز میں پیش کیا ہے۔ ایسی حقیقتیں جو مفلس و کنگال اور تونگر و غنی سب کی زندگی کا محور ہے..... اگر دہلی کو میر، سودا اور مصحفی جیسے نوحہ خواں ملے تو آگرہ کو نظیر جیسا ماتم کرنے والا نصیب ہوا..... نے زندگی کو دیکھا اور ہر پہلو سے دیکھا۔ مشاہدہ کی یہ وسعت اس کے شہر آشوب میں بھی کسی حد تک موجود ہے..... نظیر کے الفاظ کھردرے ہیں لیکن ان کھردرے لفظوں سے انہوں نے اپنے دور کی زندگانی کا مجسمہ تراشا ہے۔''(۶)

ابوالخیر کشفی کی رائے میں تجزیے کی غیر حقیقی سطح ہے کہ ان کے بقول ایک طرف نظیر کی زبان کھردری ہے تو دوسری طرف وہ نظیر کو "ماتم کرنے والا" قرار دیتے ہیں جبکہ حقیقت میں یہ دونوں نکات نظیر کی شاعری سے متصادم ہیں کیونکہ نظیر کی نظم کو بیسویں صدی کی نظم کے اسلوب اور آہنگ کے ساتھ موازنہ کر کے دیکھنا ہی غیر منطقی اور غیر علمی ڈسکورس ہے۔ نظیر نہ تو سودا اور میر کی طرح نوحہ خواں ہے باوجود اس کے کہ سودا اور میر کو نوحہ خواں قرار دینا بذات خود متن سے دور اور حقیقت سے متصادم تجزیہ ہے کیونکہ سودا کا شکوہ قصیدے کی دین ہے جبکہ میر کے ہاں مایوسی اور قنوطیت کے ساتھ ساتھ جسم اور اور جنس کے موضوعات بھی پوری تخلیقی توانائی کے ساتھ موجود ہیں۔ نظیر ماتم کرنے والا نہیں بلکہ حقائق کو بنا کسی مبصر کے جیسا ہے ویسا کی بنیاد پر تخلیق کرنے والا نظم نگار ہے۔ نظیر کو دیکھ کر شاعری کے متعلق روائتی تصور کہ شاعر نقال ہوتا ہے، اپنی پوری لطافت کے ساتھ درست معلوم ہوتا ہے کہ شاعری موجود اشیاء کو نئے سرے سے تخلیق کرنے کا عمل ہے۔ نظیر کی نظم کے موضوعات کو نظیر کے معاصرین سمیت نظیر کے پیش روؤں نے بھی غیر شاعرانہ قرار دے کر نظر انداز کیا ہوا تھا۔ نظیر کی شاعرانہ انفرادیت یہ ہے کہ وہ کسی بھی موضوع، خیال، مشاہدے، تجربے، واردات اور فکر کو شعری پیرائے میں بیان کرنے پر قدرت رکھتے ہیں اور اسی عمل میں ان کے ہاں زندگی کے سب سے اہم دو عوامل معاش اور ثقافت جا بہ جا بکھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ نظیر کے اسی دائروی مدار کو نظم "مفلسی" کے تناظر میں دیکھیں:

> ''جب آدمی کے حال پہ آتی ہے مفلسی
> کس کس طرح سے اس کو ستاتی ہے مفلسی
> پیاسا تمام روز بٹھاتی ہے مفلسی
> بھوکا تمام رات سلاتی ہے مفلسی

یہ دکھ وہ جانے جس پہ کہ آتی ہے مفلسی
کہیے تو اب حکیم کی سب سے بڑی ہے شاں
تعظیم جس کی کرتے ہیں نواب اور خاں
مفلس ہوئے تو حضرت لقماں کیا ہے یاں
عیسیٰ بھی ہو تو کوئی نہیں پوچھتا میاں
حکمت حکیم کی بھی ڈوباتی ہے مفلسی'' (مفلسی)

نظیر سماجی عمل میں پیسے کی فراوانی اور کمتری کے اس نظام کو کس خوبی سے نظم کر رہا ہے کہ جب آدمی کے حال پر غربت وافلاس اور مفلسی کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ کئی طرح کی مشکلات سے دوچار ہو جاتا ہے۔ مفلسی نظم میں متحرک عامل ہے جو اپنے ساتھ منسلک آدمی ہوستاتی ہے۔ نظم میں ستانے کا لفظ اس کی معنویت کو دو چند کر دیتا ہے کیونکہ ستانے سے مجازی مراد کسی فرد کو مسلسل کوفت میں مبتلا کرنا، اس کے مزاج کے خلاف جانا اور اسے جسمانی و ذہنی سطح پر بے چین رکھنے کے ہیں۔ نظیر کہتے ہیں کہ آج کے زمانے میں مفلسی پانی تک رسائی بھی چھین لیتی ہے کہ مفلس آدمی تمام روز گویا دن بھر یا کئی دن تک پیاسا رہتا ہے کیونکہ جدید سرمایہ بنیاد سماجی نظام میں پانی بھی ایک پراڈکٹ ہے جسے صارف نے دولت کے بدلے خریدنا ہے۔ یہاں نظیر ایک طرف پیسے کی اہمیت کو بیان کر رہا ہے تو دوسری طرف ہندوستان میں بدلتی ثقافتی صورت حال کو سامنے لا رہا ہے کہ جہاں سب سے سستا سمجھا جانے والا پانی بھی اب روپوں کے بدلے دستیاب ہوتا ہے۔ اگر مفلسی انسان کو گھیرے میں لے لے تو قدیم زمانے میں مفت حاصل ہونے والا پانی بھی انسان کی پہنچ سے دور ہے جس کی وجہ سے یہ مفلسی اسے پیاسا بٹھائے رکھتی ہے اور یہ مفلسی ہی ہے جو اسے تمام رات بھوکی رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ ہند پاکستان کی قدیم ثقافتی تنظیم میں عام سے عام آدمی رات کا کھانا پیٹ بھر کر کھاتا تھا جبکہ برطانوی راج کے استحکام کے بعد بھوک اور افلاس نے ہندوستان کے عام آدمی کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ انگریز راج کے استحکام کے ساتھ ہی ثقافتی طور پر زرخیز اور مالی طور پر مستحکم ہندوستان میں روٹی اور پانی عام آدمی کی پہنچ سے دور ہو گئے تھے جس کے سبب سے نچلے طبقے کے لوگوں کو بہ سبب مجبوری بھوکے پیٹ بھی سونا پڑتا تھا اور اس مشکل کو وہی انسان سمجھ سکتا ہے جس کو درپیش ہو۔ نظیر کا انفرادیہ ہی ہے کہ وہ کسی بھی موضوع پر تنقیدی، توصیفی، عالمانہ رائے دینے کی بجائے جو ہے جیسا ہے کی بنیاد پر بیان کرتا جاتا ہے۔ نظیر کے زمانے میں راجوں، مہاراجوں، ریاستوں کے خان لوگوں کی نظر میں نئی نئی عورتوں کا شوقین ہونے کے سبب سے حکیم لوگوں کی بڑی اہمیت ہوتی تھی لیکن ہر حکیم کو نواب تک رسائی حاصل نہ تھی اور بعض حکیم نہایت عسرت کی زندگی گذارنے پر مجبور تھے۔ حکیم کو ہی عیسیٰ کا درجہ دیا جاتا ہے کیونکہ وہ انسان کو زندگی دیتا ہے۔ اس پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نظیر لکھتے ہیں کہ مفلسی حکیم کی تعظیم جو کہ نواب اپنی ضرورت کے باعث کرتے ہیں، مفلسی کی وجہ سے جاتی رہتی ہے۔ عام آدمی تو عام آدمی یہ مفلسی تو عیسیٰ ایسے صاحب اعجاز اور کشف و کرامات کو بھی مجبور اور لاچار بنا دیتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں نظیر اپنے معاشرے کی قدیم اساطیری ثقافتی نہاد کو نئے عہد کی سرمایہ بنیاد ثقافتی ترتیب کے ساتھ تقابل کی صورت بیان کر کے، معاشی اور ثقافتی بدلاؤ کے عمل کو خوبی کے ساتھ سامنے لاتا ہے یہاں تک کہ یہ مفلسی کا دیو حکیم کی لٹیا ڈبو دیتا ہے۔ یہی موضوعات نظیر کی شاعری میں

اپنی اولین پیشکش کی وجہ سے نئی نظم کے موضوعاتی پھیلاؤ کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوتے ہیں اور اپنے عہد کی ثقافتی تہوں کو شعری پیرائے میں بیان بھی کرتے ہیں۔ نظیر کے شعری رنگ کے حوالے سے ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھتے ہیں:

> ''آگرہ میں مستقل طور پر آباد ہونے والا شاعر نظیر دنیا کے منظروں، موسموں، تہواروں، میلوں، بازاروں اور گلی کوچوں کی متنوع زندگی کو اُردو شاعری کے کینوس پر اتارنے کا عزم لے کر اٹھا تھا۔ اس نے انسانی فکر و فلسفہ کی جگہ عام انسانی زندگی کو اس کینوس پر منتقل کیا اور اسی طرح اپنے دور کی زندگی کا ان تھک مصور بن گیا۔''(۷)

آگرہ صرف نظیر اکبر آبادی کی جائے بود و باش نہیں بلکہ میر تقی میر اور مرزا اسد اللہ غالب بھی اسی خطۂ زمین سے وابستہ رہے لیکن جس طور پر زندگی کی جزئیات اور ارتقا پذیر ہندوستانی ثقافت کو تمثال در تمثال نظیر نے خلق کیا ہے یہ خوبی کسی اور شاعر کے حصے میں نہیں آئی۔ جیسا کہ اوپری سطور میں مفلسی اور روٹی ایسی نظموں کے متنی تجزیے سے نظیر کے فکر و فن کو بیان کیا گیا ہے کہ کیسے شاعر نے مفلسی اور روٹی ایسی نظموں سے انسان کے روایتی قدیم ثقافتی معاشی منظر نامے کے مقابل اٹھارہویں صدی کے معاشرے کی تصویر کشی کی ہے۔ نظمیں صرف آٹے، جو، باجرے، مکئی، گندم سے بنی روٹی کی جزئیات اور اس روٹی کے جڑے دولت اور مفلسی کے مختلف مظاہر تک محدود نہیں رہتیں بلکہ یہ معاشی جبر اور ثقافتی ورثے کے اہم مظہر کے طور پر سامنے آتی ہے جو ایک طرف قدیم بادشاہی نظام میں سانس لیتے معاشرے کے برعکس استعمار کے شکنجے میں پھنسے سماج کی ثقافتی اور معاشی مسائل کی مختلف تہوں کی پیش کار ہوتی ہیں۔ کلاسیکی ہندوستان میں دربار ہر خاص و عام کے لیے ہمہ وقت روٹی پانی کے انتظامات پر مامور تھے جبکہ انگریز سامراج نے ہندوستان میں اجتماعی زندگی کے تصور کو منہدم کر کے انفرادی بود و باش کے نیا نظام متعارف کرایا جس میں روٹی کی دستیابی تو نگر جبکہ گھر کے چولہے کا سرد ہونا مفلسی کا سبب بنتا ہے یہی وہ نظام ہے جس میں ہر آدمی کو ہر طرح کیحالات میں روٹی چاہیے ہوتی ہے اگر اسے روٹی نہ ملے تو وہ مرنے مارنے کی حد تک جا سکتا ہے۔ انسان روٹی کے حصول لیے بڑے بڑے کام کرنے کو تیار ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ اس نئے سرمایہ دار معاشرے میں روٹی حاصل کرنے کے لیے عورت اپنی عزت نیلام کر سکتی ہے تو مرد دوسروں کی جان تک لینے سے گریزاں نہیں ہوتے اور ان سب مشکلات کا حل صرف اور صرف وقت پر پیٹ بھر کے روٹی حاصل ہونے سے ہی ملتا ہے۔ نظیر کی نظم مفلسی کے موضوعی منظر نامے کے حوالے سے معروف نقاد ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی رائے اہم ہے جو اس نظم کو ایک طرف نظیر کی اہم ترین نظموں میں شمار کرتے ہیں اور اس میں بیان کردہ حقائق کو فرد افراد بیان کرتے ہیں:

> ''نظیر کی یہ نظم نسبتاً طویل ہے اور انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں مفلسی کی مختلف حالتوں کا نقشہ بڑے مزاحیہ انداز میں کھینچا ہے۔ مختلف ہنرمندوں اور صنعت کاروں کا الگ الگ حال بیان کیا ہے کہ مفلسی کی بدولت وہ اپنے پیشے اور فن سب کو بھول جاتے ہیں۔ علم اور کمال دونوں مفلسی کی بدولت پامال ہو جاتے ہیں۔''(۸)

نظیر کے شعری بیان کو ابواللیث صدیقی مزاحیہ قرار دیتے ہیں جبکہ نظیر طنز کی ہلکی لہر کے ساتھ حقائق کی تصویر کاری کرتے ہیں۔ جس میں معاصر حیات کے تلخ شیریں عوامل کو ان کی موجود شکلوں میں بیان کیا جاتا ہے۔ نظیر کو مزاحیہ شاعر قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ نظیر نے مشکل سے مشکل موضوع کو مزاح کی ادبی چاشنی کے ساتھ خلق کیا ہے کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ انسان طنز و مزاح کے پیرائے میں مشکل سے مشکل اور تلخ سے تلخ موضوعات کو قابل قبول

ذائقے میں بیان کرتا ہے یا کرسکتا ہے اور اس سہولت سے اب سے پہلے نظیر اکبرآبادی نے بیت بڑے پیمانے پر استفادہ کیا ہے۔ نظم کوڑی نامہ میں دیکھیں کہ کیسے نظیر نے پیسے/ دولت کی اہمیت پر نئی نئی طرح سے شعر نکالے ہیں۔ ان مصرعوں میں ایک خلاق شاعر اور معاشی ثقافتی ڈسکورس سے آگاہ ماہر سامنے آتا ہے جو زندگی کے جدلیاتی عمل میں ثقافت اور معاش کے باہمی روابط کو ہزار شکلوں میں دیکھتا ہے اور اپنے قاری کے سامنے پیش کرتا ہے۔ نظم کوڑی نامہ سے دیکھیں:

کوڑی کے سب جہاں میں نقش ونگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھرتین تین ہیں

نئے سرمایہ دارانہ نظام میں کوئی بھی فرد پیسے کے بغیر زندگی کی کسی سہولت تک رسائی حاصل نہیں کرتا۔ پیسہ اسے رہائش فراہم کرتا ہے، پیسہ اسے لباس فراہم کرتا ہے، یہاں تک کہ پیسہ ہی اسے روٹی اور پانی فراہم کرتا ہے۔ تعیّشات تو کجا پیسے کے بغیر انسان ایک دن کے بنیادی لوازمات زندگی بھی حاصل نہیں کرسکتا یہاں تک کہ اسے بھوکے پیاسے پیٹ رہنا ہوگا اور کھلے آسمان کی چھت تان کر سونا ہوگا۔ پیسے کے بغیر نہ کوئی دوست ہے اور نہ کوئی غمخوار، نہ کوئی عزیز ہے اور نہ کوئی رشتہ دار۔ اگر انسان کے پاس پیسہ ہو تو وہ شہ نشیں ہے۔ اس کے لباس/ جامے میں سنہرے پٹکے بندھے جاتے ہیں، گھوڑے کی زین پر موتیوں کے گچھے لگائے جاتے ہیں، حتی کہ مزید بادشاہت کی چاہ، فوج وسپاہ اس کے قدموں میں ہوتی ہے جبکہ پیسے سے محروم آدمی فقیر بن کر چھڑی ہاتھ میں تھامے، رومال لے کر دکان دکان اور چوک چوراہوں پر کوڑی کوڑی کے لیے گداگری کرتا پھرتا ہے اور ہر کسی سے باتیں اور طعن سنتا ہے مگر کچھ کر نہیں سکتا۔ نظیر کے مطابق اس دنیا کے سب جھمیلے اور ساری مشکلات کا حل کوڑی یعنی پیسے کی فراوانی میں ہے۔ جنگ وجدل، ساز وسامان، تلوار و بندوق، زرہ وبکتر، گھوڑے اور ہاتھی سب کے سب پیسے کی بدولت انسان کے قدموں میں ڈھیر ہوتے ہیں اور یہی نئی انسانی زندگی کی ثقافت کا لازمی حصہ ہے۔ نظم میں آگے دیکھیں کیسے شاعر نے کوڑی کو چھوٹے بڑے، بادشاہ وزیر کے ساتھ منسلک کر کے بیان کرتا ہے:

لے مفلس اور فقیر سے تاشاہ اور وزیر
کوڑی وہ دلربا ہے کہ ہے سب کی دل پذیر
دیتے ہیں جان کوڑی پہ طفل و جوان و پیر
کوڑی عجب ہی چیز ہے میں کیا کہوں نظیر
کوڑی کے سب جہاں میں نقش ونگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو،کوڑی کے پھرتین تین ہیں (کوڑی نامہ)

نظیر نے پیسے کی فلاسفی کے عنوان سے دو نظمیں کہی ہیں۔ دونوں مخمس اور مسدس کی ہیئت میں ۱۱ اور ۱۶ بندوں پر مشتمل ہیں۔ انھوں نے نظم میں یہ بیان کیا ہے، کہ دنیاوی سطح پر جس آدمی کی دسترس میں پیسہ ہے، اسی کے سب نقش ونگار، ٹھاٹ باٹ، بہترین عمارت، کھانے پینے کی اشیا، فاخرہ لباس کو زیب تن کرنے کی سہولت، نوکر چاکر، تلوار بندوق اور دیگر اسلحہ جات یعنی دولت کے ذریعے حاصل ہونے والا تمام عیش وآرام اور جاہ وجلال اس ہی ادمی کا خیر مقدم کرتا ہے جس کے پاس یہ شے موجود ہوتی ہے۔ انسان پر عیش وعشرت کی آمد اور باغ وگلشن میں سرو وسمن، لالہ وگل کا حصول پیسے ہی کی مرہون

منت ہیں۔مگر نظیر اکبرابادی کے ہاں انسان کی مختلف ذہنی اور جذباتی کیفیات متوازی چلتے ہیں اور یہاں بھی صورت حال کا جواب عقلی استدلال پر دیا جاتا ہے کہ جب آدمی ایک گھر کو دیکھ کر حیرت وتعجب کی کیفیت میں مبتلا ہوتا ہے تو ایسا جواب ملتا ہے جس کی بنیاد عقل وشعور پر رکھی ہوتی ہے:

واں سے نکلا تو مکاں اک نظر آیا ایسا
در و دیوار سے چمکے تھا پڑا آبِ طِلا
سیم چونے کی جگہ اس کی تھا اینٹوں سے لگا
واہ وا کرکے کہا میں نے یہ ہوگا کس کا
عقل نے جب مجھے چپکے سے کہا پیسے کا

نظیر فطرتاً یاروں اور دوستوں سے بڑی رسم وراہ رکھتے تھے اور ان کو یہ مشورہ بھی دیتے تھے کہ اگر عاشق روٹھ کر منت وسماجت سے بھی راضی نہ ہو تو اسے پیسوں کی خوبیوں کی بدولت موم ونرم کیا جاسکتا ہے۔کیونکہ انسان کی عام طور پر بہت سی ضروریات اور خوشیاں پیسے کی بدولت پوری ہوجاتی ہیں۔نظیر کے نزدیک پیسہ ہی مادی جہان میں رنگ وروپ اور مال ودولت ہے۔اگر انسان کے پاس پیسہ نہیں ہے۔تو پھر وہ چرخے کی مال کے مانند ہے۔دوسری نظم کے ٹیپ کا شعر دیکھیے جو صنعت تجنیس کی بہترین مثال بھی ہے:

پیسا ہی رنگ روپ ہے پیسا ہی مال ہے
پیسا نہ ہو تو آدمی چرخے کی مال ہے

یہ حقیقت ہے کہ انسان کے دل ودماغ میں پیسے کی فراوانی کے باعث بہت سے خیالات پنپتے رہتے ہیں۔مگر مفلس وفقیر کے دل میں پیسے کی کمی کی بدولت مایوسی، زندگی سے بے تعلقہ اور سوالیہ تصورات ہی پیدا ہوتے ہیں۔انسان کو پیسے کی طاقت سے ٹھاٹ باٹ، کوٹھی بنگلہ اور دیگر لوازماتِ زندگی با آسانی دست یاب ہوتے ہیں۔انسان پیسے ہی کے ذریعے مرصع کاری، نقش ونگار حاصل کرتا ہے تو خوشبو، عنبر اور یاسمین کی خوشبوؤں سے جسم کو معطر اور چہرے کو پرنور بناتا ہے۔وگرنہ اس کے سپاٹ اور بے کیف چہرے پہ دھول ہی لپٹی رہتی ہے۔معاشرے میں پیسہ اعتبار ووقار دلانے میں بے حد معاون ثابت ہوتا ہے۔نظیر نے مزید بڑے نکتہ وراز کی بات کہی ہے کہ اگر پیسے کی فراوانی میں کسی انسان پر غم کے حالات آجائیں، تو بھی بہار کا سماں پیدا ہوجاتا ہے، مگر پیسہ نہ ہونے پر شادی میں بھی ذلت اور خواری کا ماحول بنا رہتا ہے۔ پیسے کی کمی کا شدید افسوس تو وہاں ہوتا ہے جب ایک بھائی دولت کی فراوانی اور فارغ البالی میں بھی اپنے نادار بھائی کا حال نہیں پوچھتا۔نظیر آگے بڑھ کر یہ بھی اظہار کرتا ہے کہ جس مکان میں پیسہ ہوتا ہے وہاں پر فرشتوں کے بال و پر بھی پھنستے ہیں۔ پیسے کے آگے محبوبِ خوش جمال بھی کچھ نہیں، وہ تو پرستان سے بھی پری نکال لاتا ہے۔ہاں انسان کا تلوار اٹھانا، اس پر دھار لگانا، زخم کھانا، سر کٹانا سب عمل پیسہ ہی کی محتاجی یا دستیابی سے ارزاں یا گراں ہوتے ہیں۔طرفہ تماشا تو یہ ہے کہ آدمی ہی آدمی کو پیسے کے ذریعے غلام بناتا ہے۔جدید سماج میں اس سے جسم خریدتا ہے۔وقت کی قیمت ادا کرتا ہے۔وفاداری کے نرخ طے کرتا ہے یہاں تک کہ حسن وعشق اور جسم وجنس بھی پیسے کی طاقت سے کسی بھی وقت خریدے جاسکتے ہیں۔یہاں

تک کہ نیکی اور خیر، بھلائی کے بے شمار کام بھی پیسے کے باعث ہی سہولت و آرام سے کیے جاتے ہیں یا کیے جا سکتے ہیں۔ بالآخر پیسہ ہی جہاں کے بیچ میں بہت سی چیزوں کے قائم مقام کی خدمات انجام دیتا ہے:

دین دار اس سے دہر میں کہلاتا نام ہے
پیسا جہاں کے بیچ وہ قائم مقام ہے
پیسا ہی جسم وجان ہے پیسا ہی کام ہے
پیسے ہی کا نظیر یہ آدم غلام ہے
پیسا ہی رنگ روپ ہے پیسا ہی مال ہے
پیسا نہ ہو تو آدمی چرخے کی مال ہے (پیسا)

نظیر کا کلام غریب لوگوں اور نچلے طبقے کی بدحالی کی داستان ہے۔ جہاں غربت، بے بسی، بھوک، پیاس، محرومی اور احساسِ کمتری سب کچھ موجود ہے۔ ''آٹے دال'' اسی حوالے سے لکھی گئی بہترین نظم ہے۔ نظیر نے اس نظم میں ہندوستانی معاشرے مختلف طبقات کے معاشی حالات اور آٹے دال کی ثقافتی میکانیات کو منفرد انداز میں بیان کیا ہے۔ نظیر کی اس نظم میں فرد کی بے کسی اور لاچاری کا اظہار نظمیہ قالب میں نظر آتا ہے۔ انسان کسی بھی مقام پر پہنچ جائے، کچھ بھی بن جائے، سماج میں اس کی کوئی بھی حیثیت ہو تب بھی اس کے لیے اہم اور مرکزی مسئلہ بھوک اور پیاس کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ساری مخلوق، چرند پرند، جانور سب ہی غذا کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ نظیر کی نظم میں پیش کی گئی یہ تمثال ہماری سماجی زندگی کی حقیقی تمثال ہیں جن کے بِنا انسانوں اور حیوانوں کا کوئی وجود نہیں۔ نظم ''آٹے دال کی فلاسفی'' میں دیکھیں:

گر نہ آٹے دال کا یاں کھٹکا ہوتا بار بار
دوڑتے کا ہے کو پھرتے دھوپ میں پیادے سوار
اور جتنے ہیں جہاں میں پیشہ وراور پیشہ دار
ایک بھی جی پر نہیں ہے اس سوا صبر و قرار
سب کے دل کو فکر ہے دن رات آٹے دال کا

شاعر نے جدید زندگی کے بنیادی جوہر دولت کو شکم پروری کے جملہ لوازمات پر فوقیت دے کر اسے بادشاہ کے عشرت کدے سے فقیر کی کٹیا تک پھیلا دیا ہے۔ یہ سب کے سب کردار اپنی بنیادی ضرورت آٹے دال کے حصول میں سرگرداں ہیں۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں ہم کہتے ہیں کہ نظیر نے قدیم ہندوستانی سماج کی اجتماعی اشیاء کے بدلے اشیاء اور خدمات کے بدلے خدمات والی روایت کے انہدام کے بعد پیسہ اور دولت کے بدلے ہر شئے کے حصول کے ثقافتی محرک کو تخلیقی پیرائے میں بیان کیا ہے۔ نظم میں اسی موضوع کی مزید جزئیات کو آگے دیکھیں:

گر نہ آٹے دال کا اندیشہ ہوتا سد راہ
پھر نہ پھرتے ملک گیری کو وزیر و بادشاہ
ساتھ آٹے دال کے ہی حشمت و فوج و سپاہ

جا بجا گڑھ کوٹ سے لڑتے ہوئے پھرتے ہیں آہ
سب کے دل کو فکر ہے دن رات آٹے دال کی
اپنے عالم میں یہ آٹا دال بھی کیا فرد ہے
حسن کی آن و ادا سب اس کے آگے گرد ہے
عاشقو ں کا بھی اسی کے عشق سے مُنھ زرد ہے
تا کجا کہیے کہ کیا وہ مرد کیا نامرد ہے
سب کے دل کو فکر ہے دن رات آٹے دال کی (آٹے دال کی فلاسفی)

نظیر اکبرآبادی کی نظم ''پیسہ'' میں پیسوں کی اہمیت کو لطیف پیرائے اور نفیس طرز اداء میں بیان کیا گیا ہے چونکہ نظیر ہندوستان کے مقامی لحن اور دلی کے اطراف کی زبان کے روزمرہ کو تخلیقی قالب میں ڈھالتے ہیں لہٰذا ان کے ہاں سادہ سے سادہ اور پیچیدہ سے پیچیدہ بات میں بھی ایک انداز کی موسیقیت اور آہنگ دل پذیر رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ پیسے کے بارے میں نظیر اکبرآبادی نے مسدس میں اس کی سماجی ضرورتوں اور ثقافتی عوامل کو خاص رنگ میں بیان کیا ہے۔ نظیر نے جس موضوع پر قلم اٹھایا ہے گویا اس کا حق ادا کر کے قلم توڑ کر رکھ دیا ہے بعد کا کوئی بھی تخلیق کار نظیر کے پیچھے ہی کھڑا ہو سکتا ہے اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا اور یہی نظیر کی خاص خصوصیت ہے۔ نظیر کی دو نظمیں روپیا اور پیسا ایک ہی پس منظر پر تعمیر کی گئی دو شاعرانہ عمارتیں ہیں جن کا ڈھانچہ ایک ہے جن کے در و دیوار کا نقشہ ایک ہے لیکن دونوں کے داخلے خانے الگ الگ ہیں۔ دونوں کی لفظی کائنات الگ الگ ہے اور دونوں کا مجموعی ذائقہ ایک دوسرے سے منفرد ہے۔ ان دونوں نظموں میں سماجی نظام میں زندگی کے روز و شب کی تکرار میں روپیا پیسا ہی وہ مقناطیس ہے جو آئے دن اس میں نئے نئے رنگ بھرتا ہے اور نئی نئی شکلیں بنا کر اس کی یک رنگی اور یک رخی کو ست رنگا اور ہزار چہرہ بنا کر الف لیلی سا پر تجسس اور حسین بنا دیتا ہے۔

زندگی کی سب محفلیں، شان و شوکت، زر و زیور، ٹھاٹھ باٹھ سب روپے پیسے کی بدولت ہے۔ یہ جادو کی چھڑی نہ ہو تو آدمی کنگال ہے نہ اس کی کوئی قدر ہے نہ اس کا کوئی مقام ہے۔ لوگ میلوں ٹھیلوں عید شبرات ہولی دیوالی ہر سماجی اجتماع میں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر زندگی کے متفرق رنگوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ کھاتے پیتے ہیں خوش رنگ لباس پہنتے ہیں اور یہ سب کا سب روپے پیسے کی وجہ سے ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ نظیر کے ہاں روپے پیسے کی قدر و قیمت اور اہمیت کے بارے میں کی پہلوؤں سے متون موجود ہیں۔ چمکدار لباس سے آراستہ ہوئے مرد و زن، بڑے بڑے راج درباروں اور محلاتی تعمیر، زیورات زری لباس زربفت، قسم قسم کے کھانے مختلف ذائقوں سے بھرے تھال اور دیگیں، سب میں روپے پیسے کی جھلک اور چمک دمک دکھائی دیتی ہے۔ اگر گرمی ہو تو روپے سے ہی موسم کی شدت کم کرنے کے سائنسی آلات اور دیو قامت مشینیں خریدیں جا سکتی ہیں۔

نظیر کی ایک اور نظم ''چپاتی'' بھوک و افلاس اور روٹی کی قدر و قیمت اور متعلقہ جزئیات کے بارے میں ہے۔ اس متن کی اہمیت جدید سرمایہ دارانہ معاشرے میں اسی انسان کو ہو سکتی ہے جس کے لیے ایک وقت کی روٹی یا چپاتی بھی میسر نہیں ہوتی۔ ''چپاتی'' میں نظیر نے ایک بھوکے انسان کی نظر میں روٹی کے تصور کا احساس تخلیقی متن میں بیان کیا ہے کہ کیسے

لوگ اس کو پانے کی خاطر طرح طرح کے مشکل سے مشکل جتن کرنے پر بھی آمادہ ہوتے ہیں۔

''جب ملی روٹی ہمیں، سب نورِ حق، روشن ہوئے
رات دن، شمس و قمر، شام و شفیق، روشن ہوئے
زندگی کے تھے جو کچھ نظم و نسق، روشن ہوئے
اپنے، بیگانوں کے لازم تھے جو حق، روشن ہوئے (چپاتی)

ایک اور نظم ''پیٹ'' میں بتاتے کہ انسان پیٹ کے لیے کیا کچھ نہیں کرتا ہر طرح کی ذلت برداشت کرتا ہے، اپنی آزادی کو فروخت کرتا ہے، اپنی عزت کو داؤ پر لگاتا ہے جہاں تک کہ اپنے جسم کی سوداگری کرتا ہے، ضمیر بیچتا ہے حتی کہ آج کے جدید سائنسی دنیا میں جسمانی اعضاء تک فروخت کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ یہی وہ ربط ہے جس نے آج بھی نظیر کی نظم کو ہمارے معاشرتی تفاعل کے ساتھ پیوست کیا ہوا ہے۔ نظیر نے تیزی سے بدلتی ہندوستانی ثقافت اور اس میں بدلتے معاشی منظرنامے کو خوبی کے ساتھ نظم میں بیان کیا ہے۔ آج کے سماج کی طرح اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں نظیر وضاحت کر دیتا ہے کہ اس فانی کائنات کی ساری رنگینی اور رنگارنگی کا سبب انسان اور انسان کے شکم سے جڑے دیگر معاملات ہیں:

کرتا ہے کوئی جورو جفا پیٹ کے لیے
سہتا ہے کوئی رنج و بلا پیٹ کے لیے
سیکھتا ہے کوئی مکر و دغا پیٹ کے لیے
پھرتا ہے کوئی بے سروپا پیٹ کے لیے
جو ہے سو ہو رہا ہے فدا پیٹ کے لیے (پیٹ)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں معاشی صورت حال کے بارے موجود مجموعی کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''نظیر کی کلیات کا وہ حصہ جس کا تعلق آٹا، دال، روٹی اور پیسہ سے ہے ہم اسے اقتصادی شاعری کہہ سکتے ہیں۔ یہ وہ شاعری ہے جو عہد نظیر کے انسان کی سائیکی میں معاشی بحرانوں کی تمثالیں بناتی ہے۔ اس شاعری کے اندر معاشی جبر کے شدائد میں پستا ہوا وہ انسان آتا ہے جو اپنی مادی بے بسی اور بے چارگی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یہ مظاہرہ مفلسی، کوڑی، پیسہ، زر جیسی نظموں میں دیکھا جا سکتا ہے۔'' **(۹)**

نظیر کا زمانہ موضوعی اور تکنیکی سطح پر روایتی شاعری کا عہد ہے جس میں ایک طرف غزل گوئی کی فارسی سے متاثرہ مضبوط بنیادیں ہیں تو دوسری طرف قصہ کہانی اور داستان طرازی کے جوہر پر مثنوی کے تخلیقی متون موجود ہیں۔ ان سب کی بنیاد روایتی عروضی نظام، ردیف قافیہ اور طے شدہ شعری موضوعات پر ہے۔ نظیر نے بھی کئی مقامات پر روائتی انداز تخلیق ہی اپنایا جیسے نظیر کے عروضی دائرے روائتی ہیں ان کے ہاں کلاسیکی مسدس، مخمس تکنیک کے علاوہ مثنوی کے طرز پر طویل نظموں کے کئی نمونے موجود ہیں۔ نظیر کا انقلاب موضوعاتی سطح پر رائج مضامین سے انحراف اور نئے نئے موضوعات پر قلم اٹھانا ہے جیسا کہ تبسم کاشمیری نے لکھا کہ نظیر کی نظم پیچیدہ معاشی صورت حال کی عکاس ہے لیکن وہ اس متن میں جاری ثقافتی کشاکش

کی طرف توجہ نہ کر سکے۔ جیسا کہ منتخب نظموں کے متنی مطالعات سے تجزیات کیے گئے ہیں کہ نظیر کی نظم انگریز استعمار کے زیر اثر تیزی سے بدلتی ثقافتی میکانیکی صورت حال کا تخلیقی بیان ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جس شاہ وطن اپنے گلے کا ہار سائل کے ہاتھ نہیں دیتا نہ ہی اس زمانے میں ایک لفظ کے تقاضے پر گندم کی بوری تحفے میں مل جاتی ہے بلکہ یہ زمانہ سکے کی ایجاد اور دولت کے ارتکاز کے سبب سے قدیم عہد سے متصادم نئی بنتی شکلوں کا زمانہ ہے جس کے تمثال نظیر کے علاوہ کسی شاعر کے ہاں دکھائی نہیں دیتے۔ پروفیسر مجنوں گورکھپوری کی رائے کے بعد مقالے کو مجموعی حاصلات کے بیان کے بعد اختتامی مرحلے پر لے کر جائیں گے۔ مجنوں گورکھپوری نظیر اکبرابادی شعری کائنات کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''موجودہ دور میں نظیر کی طرف لوگ توجہ کرنے لگے تھے اور ہر طرف یہی سُننے کو مل رہا ہے کہ نظیر، اپنی ذات میں تنہا ایک دبستان اور جماعت تھے۔''(۱۰)

نظیر اکبرآبادی اپنے مجموعی مزاج میں بالکل نئے منفرد اور رجحان ساز شاعر ہیں۔ نظیر کی اس رجحان سازی اور متاثر کرنے کی صلاحیت پر مجنوں گورکھپوری نے انہیں دبستان اور جماعت قرار دیا ہے۔ ایسا دبستان جو اپنے سے متاثر ہونے والے لوگ ہر زمانے میں پیدا کرتا ہے اور ہر عہد کے تخلیقی سرنامے پر اپنے نقش چھوڑتا۔ نظیر اکبرآبادی کی نظم نگاری کے جملہ خصائص کو ڈاکٹر جمیل جالبی کے اس متن میں دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے:

> ''نظیر اکبرآبادی کی شاعری میں دو اہم پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے انسان کے معاشرتی و تہذیبی رویے، عقائد، رسومات، توہمات، مشغلے اور انداز نظیر کی شاعری کے تخلیقی عوامل میں شامل ہو گئے..... دوسری بات یہ کہ نظیر میں چونکا دینے والی چیز ان کے موضوعات ہیں۔ جن موضوعات پر وہ لکھتے ہیں کسی اور شاعر نے اب تک توجہ نہیں دی تھی۔ نظیر ان موضوعات سے اپنے گرد و پیش کی معاشرتی و تہذیبی زندگی سے براہ راست اپنی شاعری کا تعلق قائم کر دیتے ہیں۔''(۱۱)

نظیر کی نظم میں تہذیب، تمدن، سیاسی سماجی کشاکش کو ہر نقاد نے دیکھا ہے۔ نظیر کے نئی نظم پر اثرات کو بھی وسعت نظری سے دیکھا گیا ہے۔ حالی، آزاد اور انجمن پنجاب کے تناظر میں بھی نظیر کے متون اور مجموعی فضاء کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ نظیر کی رنگا رنگ زبان اور اس کی وسعت کو بھی کئی ناقدین نے مطالعاتی ڈسکورس کا مرکز بنایا ہے لیکن جو ثقافتی ارتقائے نظم نظیر کا خاصہ ہے۔ اردو کے ناقدین اور محققین کی توجہ کا متقاضی ہے۔ نظیر کی نظموں کے متنی مطالعات اور ان کی زندگی کے مختلف عوامل کو نگاہ میں رکھ کر اس شہری زندگی کے ابتدائی نقوش کو تلاش کیا جا سکتا ہے جن کی طرف نظیر نے نیم شہری قصباتی ماحول کی تمثال کاری سے توجہ دلائی ہے۔ اردو کی روایتی شاعری میں یا تو دربار کی پیشکش ہے یا پھر صوفیانہ رنگ غالب ہے جس میں زندگی اور موت فنا اور بقا کے موضوعات کو روزمرہ کی زندگی کے تفاعل پر فوقیت دے کر حاصل اور پا حاصلی، موجود اور غیر موجود، حاضر اور غائب، وجود اور شہود جیسے لاتعداد موضوعات کو بیان کیا گیا ہے۔ غزل نے انسانی نفسیات اور دل کے داخلی خارجی ماحول کی عکاسی ضرور کی ہے لیکن اس میں بھی غالب تمثال دربار اور بادشاہ، حملہ اور اور افواج سمیت اس موضوع سے جڑے دیگر متعلقات کا بیان ہے۔

نظیر کے شعری متون وہ ابتدائی متون ہیں جن میں دیگر جملہ خصوصیات کے علاوہ ثقافتی تفاعل کی مسلسل ارتقا پذیری کو پوری تخلیقی توانائی اور فطری رفتار کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔ تجزیہ کی گئی نظموں کے متنی نہایت قلیل ہیں نظیر کی دیگر

کئی نظموں کے مطالعات سے اس مفروضے کی تائید میں بہت سا مواد دیکھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ ان نظموں میں مہادیو جی کا بیاہ، دارالمکافات، جاڑے کی بہاریں، سامان دیوالی کا، گرو نانک، ہولی، خوشامد، راکھی، جھونپڑا، شب برات، مفلسی، روٹیاں، برسات کی بہاریں سمیت کئی دیگر نظمیں ہیں۔ ہولی جیسے ثقافتی تہوار پر نظیر کی نظمیں درجن بھر کے قریب ہیں۔ جن میں ہندوستان ثقافت کے متفرق تمثال اور اساطیری نشانات کو تخلیقی قالب میں ڈھالا گیا ہے۔

نظیر نے طویل عمر پائی اور لگ بھگ سو برس کی زندگی گذار کر اخیر عمر میں فالج کے حملے سے ۱۸۳۰ء میں عازم سفر ہوئے اور اردو شاعری کی سلطنت پر ان مٹ نقوش چھوڑے۔ نظیر کے بیٹے خلیفہ گلزار علی اسیر اسیر نظیر اکبر آبادی کا قطعہ تاریخ وفات لکھا۔ یاد رہے یہ قطعہ لکھنے کی روایت بھی اب معدوم ہوتی جا رہی ہے جو کہ مشاہیر کے زمانی وقفے کے علاوہ ان کے سال پیدائش اور سال وفات کی معلومات بارے اہم ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قطعہ کچھ ہوں ہے کہ:

چہ خوش در رحلتش آورد فکر طبع تاریخے
نظیر اکبر آبادی ، چوزیں دنیائے ابتر شد
نظام نظم، باہم درہم و برہم شدہ یکسر
مخمس بے سروپا، بیت بے دل، فرد بے سرشد (۱۲)

## حوالہ جات


1. Encyclopedia Americana, (Danbury, Conn: Grolier, 1987). vol. 7, P. 298
2. Nicholas Harrison. Post Colonial Criticism. History Theory and work of fiction.(Cambridge: Polity press in association with Blackwell publishers, 2003), P. 18
3. Preferences to new Hindustani English Dictionary by S.W. Fallon, (London, 1879), P. 8,9

۴۔ جمیل جالبی،تاریخ ادب اردو،جلدسوم،(لاہور:مجلس ترقی ادب،۲۰۱۶ء)،ص۱۰۰۴
۵۔ ایضاً،ص۱۰۰۵
۶۔ ابوالخیر کشفی،اُردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر (۱۷۰۷ءتا۱۸۵۷ء)،(اسلام آباد:نیشنل بک فاونڈیشن،۲۰۱۷ء)،ص۱۹۵،۱۹۶
۷۔ تبسم کاشمیری،اُردو ادب کی تاریخ:ابتداء سے۱۸۵۷ءتک،(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۳ء)،ص۵۵۲
۸۔ ابواللیث صدیقی،نظیر اکبر آبادی :اُن کا عہد اور شاعری،(کراچی:اردو اکیڈمی،۱۹۵۷ء)،ص۲۲
۹۔ تبسم کاشمیری،اُردو ادب کی تاریخ:ابتداء سے۱۸۵۷ءتک،ص۵۵۴
۱۰۔ مجنوں گورکھ پوری،ادب اور زندگی،(لکھنو:کتب خانہ دانش محل،۱۹۴۴ء)،ص۲۸۲
۱۱۔ جمیل جالبی،تاریخ ادب اردو،جلدسوم،ص۱۰۱۱
۱۲۔ بحوالہ:روحِ نظیر،از:سید محمد محمود مخمور اکبر آبادی،(آگرہ:گیا پرشاد اینڈ سنز پبلشرز،۱۹۴۶ء)،ص۴۰